

الانفال - التوبة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس آخری دینونت کے لیے تیاری اور مسلمانوں کے تزکیہ و تطہیر کی ہدایات دی گئی ہیں، دوسری اسی کے ظہور کا بیان ہے۔ دونوں کے مخاطب اہل ایمان ہیں اور ان کے مضمون سے واضح ہے کہ مکہ مکرمہ طیبہ میں یہ دونوں سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلہ جزا و جزا میں نازل ہوئی ہیں۔

پہلی سورہ — الانفال — کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کے خلاف آخری اقدام کی تیاری اور اس کے لیے مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر ہے۔

دوسری سورہ — التوبہ — کا موضوع انہی منکرین کے لیے، خواہ وہ کھلمنکر ہوں یا منافقین خدا کی آخری دینونت کا ظہور ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورة الانفال

(۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاِنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوا ذَاتَ

۱

اللہ کے نام سے جو نمر اسرار رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

وہ تم سے غنائم کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ انھیں بتا دو کہ یہ سب غنائم اللہ اور رسول کے ہیں۔

۱ آیت میں لفظ 'الْاَنْفَالِ' آیا ہے۔ 'نفل' اُس چیز کو کہتے ہیں جو حق سے زیادہ حصہ مزید کے طور پر دی جائے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کا اجر تو اُس کے ہاں بالکل الگ اور دائمی طور پر محفوظ ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ جو مال غنیمت دشمن سے حاصل ہوتا ہے، وہ ایک حصہ مزید ہے۔ قیامت سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں مجاہدین کو عطا کر دیتے ہیں۔

۲ یہ سوال اعتراض کی نوعیت کا ہے اور غزوہ بدر میں حاصل ہونے والے مال غنیمت سے متعلق پیدا ہوا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ جو جتنا مال جنگ میں لوٹے، وہ اسی کا حق ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے بعد جب لوٹنے والوں سے دوسروں نے جنگی خدمات کی بنا پر اپنے حق کا مطالبہ کیا تو اُس سے ایک نزاع پیدا ہو گئی جس نے کسی حد تک تلخی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ سوال اسی پس منظر میں اور مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے کیا

بَيْنَكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ

اس لیے اللہ سے ڈرو، (اس معاملے میں کوئی نزاع پیدا نہ کرو اور) اپنے آپس کے معاملات کی اصلاح کر لو اور اللہ اور اُس کے رسول کا حکم مانو، اگر تم مومن ہو۔ (یاد رکھو)، اہل ایمان تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اُس کی آیتیں اُنھیں سنائی جاتی ہیں تو

گیا ہے*۔

۳ یعنی اس وقت جو غنائم حاصل ہوئے ہیں، اُن کے متعلق خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن پر کسی شخص کا بھی کوئی حق قائم نہیں ہوتا۔ یہ سب اللہ اور رسول کا ہے اور وہ اس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں گے، اپنی صواب دید کے مطابق کریں گے۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ زمانہ رسالت کی جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور ان میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلائت و جوارح کی تھی۔ وہ اللہ کے حکم پر میدان میں اترے اور براہ راست اُس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے تھے۔ لہذا ان جنگوں کے مال غنیمت پر اُن کا کوئی حق اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا، تاہم آگے جا کر بتا دیا ہے کہ اس کے باوجود یہ سارا مال نہیں، بلکہ اس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی ازارہ عنایت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۴ مطلب یہ ہے کہ بحث و اختلاف کی گرما گرمی میں اگر کوئی بدگمانی یا رنجش پیدا ہوگئی ہے یا اپنے بھائیوں کے بارے میں رشک و حسد کے جذبات کسی کے دل میں ابھرے ہیں کہ فلاں اور فلاں کو اس مال میں کیوں شریک بنایا گیا ہے، تو اپنی اصلاح کر لو۔ تم سب بھائی بھائی ہو۔ تمہارے تعلقات اخوت، رحم اور محبت کی بنیاد پر قائم ہونے چاہئیں۔ یہ ایمان و تقویٰ کے منافی ہے کہ تمہارا دامن دل حسد، رقابت اور خود غرضی کے غبار سے آلودہ ہو، اسے پاک صاف کر لو۔

۵ یہاں سے آگے سچے اہل ایمان کی تصویر ہے جو اُن لوگوں کے سامنے رکھی گئی ہے جنھیں اگر تم مومن ہو، کے الفاظ میں خطاب فرمایا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔ ان کے بغیر یہ دعویٰ کسی کو زیب نہیں دیتا۔

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۵۷۰۔

يَتَوَكَّلُونَ ﴿٢﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٣﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ

اُن کا ایمان بڑھادیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور جو کچھ

۱۔ یہ سچے اہل ایمان کی پہلی علامت بتائی ہے کہ وہ خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا شعور رکھتے ہیں، لہذا خدا کی کوئی بات بھی اُن کے سامنے پیش کی جائے، وہ اس گہرے احساس کے ساتھ اُس کو سنتے ہیں کہ یہ اُس ہستی کا ذکر ہو رہا ہے یا اُس کے نام پر کوئی بات کہی جا رہی ہے، جس کی ناراضی کا خوف ہر انسان کے نہاں خانہ وجود میں جاگزیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُن کا دل اس گہرے احساس سے لرز جاتا ہے۔

۲۔ یہ دوسری علامت ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ آیات سے یہاں کتاب الہی کی وہ آیات مراد ہیں جن میں خدا کے احکام اور قوانین بیان ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اہل ایمان جب ان احکام و قوانین کو سنتے ہیں تو انہیں ایمان ہی کا مظہر اور اُس کے مضمرات کی تفصیل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایمان کے شجرہ طیبہ پر یہ برگ و بار دیکھ کر اُن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے ان مطالبات کو جب وہ پورا کرتے ہیں تو امتحان و آزمائش کے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اُن میں خدا کی تائید و نصرت کا ظہور اور کامیابی سے گزرنے کے بعد فتح مندی کا احساس بھی اُن کے ایمان کو قوی سے قوی تر بنا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”رَأَدَتْهُمْ اِيْمَانًا“ کے اسلوب بیان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اندر ایمان موجود ہوتا ہے، جب اُن کے سامنے ایمان کے مقتضیات و مطالبات آتے ہیں تو وہ پوری بشاشت سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ ان مقتضیات و مطالبات کو اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کا پھل اور اپنی ہی بوٹی ہوئی کھیتی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر کسان اپنی کھیتی کے حاصل اور اپنے درخت کے پھلوں میں افزونی دیکھ کر باغ باغ ہوتا ہے، اسی طرح یہ اہل ایمان بھی اپنے ایمان کی یہ افزائش دیکھ کر شادمان ہوتے ہیں۔ یہ گویا اُن مدعیان ایمان پر ایک لطیف تعریف ہوئی جو ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے، لیکن جب اُس کے مطالبے سامنے آئے تو اُن سے خوش ہونے کے بجائے اُن کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے کہ یہ کیا بلاناازل ہوگئی۔“ (تدبر قرآن ۳/۳۲۲)

۸۔ یہ تیسری علامت ہے۔ یعنی امتحان و آزمائش کے مراحل میں وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ انہیں یقین کامل ہوتا ہے کہ اُن کے پروردگار نے جو حکم بھی دیا ہے اور جس امتحان سے بھی گزارا ہے، اُس میں سر تا سر انھی کی فلاح ہے۔ چنانچہ تمام احکام اور تمام امتحانات کو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اُن میں یقیناً کوئی حکمت و مصلحت پوشیدہ ہوگی اور جلد یا بدیر وہ اُن کے لیے رحمت و برکت کی صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۴﴾
كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ مَبِيتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكُرْهُوْنَ ﴿۵﴾

ہم نے انہیں دیا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے مومن ہیں۔ ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے درجے ہیں، مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔ ۱-۴
اسی طرح کی صورت اُس وقت پیش آئی تھی، جب تمہارے پروردگار نے ایک مقصد حق کے ساتھ

۹ یہ چوتھی علامت ہے اور اس میں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں، وہ سب کی جامع اور محافظ ہیں۔ ایمان جو اوصاف اہل ایمان کے اندر پیدا کرتا ہے، اُن کی شیرازہ بندی انہی دو چیزوں — نماز اور انفاق — سے ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ اسی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں۔
۱۰ یعنی اُن کے ایمان و یقین کی کیفیات اور اُن کے ظہور کے لحاظ سے درجے ہیں، اُن کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے خدا کا دامن مغفرت ہے اور اس کے نتیجے میں ایسی روزی ہے جو اس عزت کے ساتھ دی جائے گی کہ یہ درحقیقت انہی کا حق ہے جو انہیں دیا جا رہا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ ان آیتوں میں جس ایمان کا ذکر ہوا ہے، وہ قانونی اور فقہی ایمان نہیں ہے جس سے لوگوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا جاتا ہے، بلکہ حقیقی ایمان ہے اور یہ ہرگز کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ اللہ کے ذکر اور اُس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس و آفاق میں اُن کے ظہور سے اس میں افزونی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے دوسری جگہ اسے ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین کے اعماق میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ چنانچہ انسان اگر اپنے ایمان کو علم نافع اور عمل صالح سے برابر بڑھاتے رہنے کے بجائے اُس کے تقاضوں کے خلاف عمل کرنا شروع کر دے تو یہ کم بھی ہوتا ہے، بلکہ بعض حالات میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

۱۱ اصل میں لفظ 'کَمَا' ہے۔ یہ واقعہ سے واقعہ کی مماثلت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں اس کا مشبہ اور مشبہ بہ متعین الفاظ کے اندر نہیں ہوتا، بلکہ بحیثیت مجموعی واقعہ کے اندر ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اوپر مال غنیمت سے متعلق نزاع کا ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح کا ایک معاملہ جنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے پیش آیا تھا۔ تزکیہ و تطہیر کی ضرورت سے قرآن نے اُسے بھی ساتھ ہی موضوع بنا لیا ہے۔

۱۲ اس کی وضاحت آگے فرمادی ہے کہ وہ مقصد حق یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿٦﴾
وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ
تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ﴿٧﴾

تم لوگھر سے نکلنے کا حکم دیا اور مسلمانوں کے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔^{۱۳} وہ اس مقصد حق کے معاملے میں تم سے جھگڑ رہے تھے، اس کے باوجود کہ (اُن پر) وہ اچھی طرح واضح تھا۔ اُن کا حال یہ تھا کہ گویا آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ اُس وقت کو یاد کرو، جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ تمہیں وہ ملے جو مسلح نہیں

منکروں کی جڑ کاٹ دی جائے۔ اس سے قرآن نے اُن روایتوں کی ترویج کر دی ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اُس تجارتی قافلے کو لوٹنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تھے جو ابوسفیان کی سربراہی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ ابتداء ہی سے قریش کی ہزیمت پیش نظر تھی اور نکلنے کی ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی تھی تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے۔ یہ چیز، ظاہر ہے کہ کسی تجارتی قافلے کو لوٹ لینے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۳ آیت میں فَرِيقًا کا لفظ بتاتا ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی جن پر یہ دیکھ کر دہشت طاری ہو رہی تھی کہ پیش نظر تجارتی قافلہ نہیں، بلکہ قریش کا لشکر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لشکر کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے نکل رہے ہیں۔ تاہم یہ گروہ اتنا قابل لحاظ ضرور تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے تزکیہ و تطہیر کے لیے اس کا رویہ زیر بحث آیا ہے۔

۱۴ اصل میں لفظ يُجَادِلُونَكَ آیا ہے۔ اس کے معنی یہاں بلطائف الجیل مخاطب سے اپنی بات منوانے کے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا اُن پر واضح تھا کہ آپ لشکر ہی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، وہ موت کے خوف سے آخر وقت تک سخن سازی کرتے اور زور لگاتے رہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے آپ کو قائل کر لیں کہ لشکر کے مقابلے میں جانے کے بجائے قافلے کو لوٹنا زیادہ قرین مصلحت ہے، اس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو سنبھالنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨﴾

۱۶ ہے اور اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے کلمہ حق کا بول بالا کرے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے، خواہ ان مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ ۵-۸

۱۵ اس وعدے میں ابہام کا اسلوب ہے۔ یعنی دو ٹوک انداز میں یہ نہیں کہا گیا کہ تجارتی قافلے کی حفاظت کا بہانہ بنا کر قریش نے حملے کے لیے فوج بھیج دی ہے، اُس کے مقابلے کے لیے نکلو، اللہ اُس کو تمہارے قابو میں کر دے گا، بلکہ ابہام کا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک تمہیں مل جائے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مخلصین اور منافقین کو الگ الگ کرنا مقصود تھا تاکہ ایک بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر مہاجرین و انصار کے اکابر کی جو تقریریں روایتوں میں نقل ہوئی ہیں، اُن سے صاف واضح ہے کہ وہ حضور کا یہ منشا پوری طرح سمجھ گئے تھے۔* استاذ امام کے الفاظ میں، اُنہوں نے آپ کے استفسار کے جواب میں الہامی تقریریں کہیں جن کی گونج اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گی، جن کا ایک ایک لفظ میدان جہاد کا رجز ہے اور جن کی حرارت ایمانی چودہ سو سال گزرنے پر بھی ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ تقریریں، ظاہر ہے کہ کسی تجارتی قافلے پر حملے کے لیے نہیں کی گئی تھیں۔

۱۶ یہ ضعیف الایمانوں کے اسی گروہ قلیل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُن پر بھی، جیسا کہ فرمایا ہے، حقیقت بالکل واضح تھی، مگر اپنی بزدلی کے باعث وہ چاہتے تھے کہ قافلے کا قصد کیا جائے جو غیر مسلح ہے تاکہ کوئی خطرہ پیش نہ آئے اور مال غنیمت بھی حاصل ہو جائے۔

۱۷ اس سے وہ کلمات مراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے لیے گھر سے نکالنے اور بعد میں آپ کی تائید و نصرت کے لیے صادر ہوئے۔

۱۸ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کی روشنی میں غزوہ بدر کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ اُس سے بالکل مختلف ہے جو سیرت و مغازی کی کتابوں میں پیش کی گئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں کے ذہن میں قریش کے قافلہ تجارت

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۲۳۳۔

سے تعرض کرنے کا کوئی خیال موجود نہیں تھا۔ مدینہ پر حملے کی ساری اسکیم قریش نے بنائی اور اُس کے لیے قافلہ تجارت کی حفاظت کا بہانہ تراشا۔ قریش مدینہ میں مسلمانوں کے جڑ پکڑنے سے بہت خائف تھے۔ مذہبی عناد کے علاوہ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اب مکہ اور شام کی تجارتی شاہ راہ اُن کے لیے محفوظ نہیں رہے گی ہے۔ اس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی عذر تلاش کر کے مسلمانوں کو ایک قوت بننے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ اب یا تو قافلہ تجارت کے سالار ابوسفیان نے واپسی کے موقع پر کوئی وہمی خطرہ مسلمانوں کے حملے کا محسوس کیا ہو کہ آدمی بھیج کر قریش کو حملے کی خبر بھیج دی یا اس کے لیے بھی پہلے سے قریش کے لیڈروں میں کوئی سازش رہی ہو، بہر حال ابوسفیان کی اطلاع پر مکہ سے ایک بھاری بھار کھنکر مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ مرحلہ ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روایا کے ذریعے سے یہ اطلاع ہوتی ہے کہ قریش کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک سے مسلمانوں کا مقابلہ ہونا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ سے بدر کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے صورت حال مبہم انداز میں اُن کے سامنے رکھی کہ کفار کی دو جماعتیں آ رہی ہیں جن میں سے ایک سے ہمارا مقابلہ ہوگا اور وہ ہم سے شکست کھائے گی۔ مسئلہ کے سامنے آتے ہی مہاجرین و انصار سب سمجھ گئے کہ قریش کی فوج آ رہی ہے اور اُس سے معاملہ درپیش ہے۔ چنانچہ اُن کے لیڈروں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفاداری اور اسلام کے لیے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا۔ البتہ ایک مختصر سی ٹولی اُن میں ایسی بھی تھی جس نے اپنا زور اس بات کے لیے لگایا کہ قریش کی فوج کے بجائے قافلہ تجارت کا رخ کیا جائے تاکہ بغیر ایک قطرہ خون بہائے بھاری غنیمت ہاتھ آئے۔ اسی گروہ کو بے نقاب کرنے کے لیے حضور نے اپنی بات مبہم انداز میں پیش کی تھی تاکہ جن لوگوں کے اندر کوئی کمزوری چھپی ہوئی ہے، وہ اپنی کمزوری ظاہر کر دیں اور مخلص و منافق میں مرحلہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی امتیاز ہو جائے۔“ (تذکر قرآن ۳/۳۹۹)

[باقی]